۱۶

اِسلام کا نظامِ مصارف

واقیموا الوزن
بالقسط
ولا تخسروا المیزان

شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اِسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

سلسلہ مطالعہ اسلامی قانون (۱۶)

اسلام کا نظام مصارف

شہزاد اقبال شام

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اسلام کا نظام مصارف

تالیف: شہزاد اقبال شام

نظر ثانی وراہ نمائی: ۱۔ جسٹس ڈاکٹر فدا محمد خان

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن

۳۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی

ادارت: ڈاکٹر محمد میاں صدیقی

نظر ثانی طبع دوم: ڈاکٹر عبدالمالک عرفانی

نگران شعبہ مطالعہ اسلامی قانون: ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں

ناشر: شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

طابع: اظہار پرنٹرز۔۹، ریٹی گن روڈ لاہور

طباعت اوّل: ۱۹۹۳ء ، دوم: ۱۹۹۷ء

سوم: ۲۰۰۶ء

قیمت: ۳۰ روپے

فہرست مضامین

		صفحہ نمبر
۱۔	اسلامی نظام مصارف کے چند راہنما اصول	۱
(۱)	پہلا اصول، اعتدال	۱
	الف۔ بخل اور ہوس مال سے گریز	۲
	ب۔ اسراف یا فضول خرچی سے اجتناب	۳
	ج۔ راہ اعتدال	۳
(۲)	دوسرا اصول، امانت	۴
(۳)	تیسرا اصول، عدل	۴
(۴)	چوتھا اصول، عدل اجتماعی	۵
۲۔	بیت المال کے چار مالیاتی مد	۶
(۱)	پہلی مد کے اخراجات	۷
	الف۔ فقراء پر خرچ	۸
	ب۔ مساکین پر خرچ	۹
	ج۔ زکوٰۃ جمع کرنے والے افراد پر خرچ	۹
	د۔ مُؤَلَّفَۃُ القلوب کے لیے خرچ	۱۰
	و۔ غلاموں کو آزاد کرانے پر خرچ	۱۱
	ی۔ قرض داروں کی اعانت	۱۱
	ھ۔ فی سبیل اللہ خرچ	۱۲
	ر۔ مسافروں پر خرچ	۱۲
	ز۔ یتیموں پر خرچ	۱۳

(۲) دوسری مد کے اخراجات ۱۳
الف۔ غیر مسلموں پر خرچ ۱۴
ب۔ عاملین کا مشاہرہ ۱۴
ج۔ حکومت کے انتظامی اخراجات ۱۴
د۔ ترقیاتی منصوبے ۱۵
و۔ قیام عدل ۱۵
ی۔ خبر رسانی ۱۶
ھ۔ دعوت و تبلیغ ۱۶
(۳) تیسری مد کے اخراجات ۱۶
الف۔ بلاامتیاز مذہب نادار افراد پر خرچ ۱۷
ب۔ قیدیوں پر خرچ ۱۸
ج۔ اجتماعی کفالت ۱۸
د۔ متفرق ۱۸
(۴) چوتھی مد کے اخراجات ۱۹
۴۔ مزید مطالعہ کے لیے ۲۱
۵۔ حواشی و حوالہ جات ۲۲
۶۔ مصادر و مراجع ۲۳

پیش لفظ

اسلام کی طویل فکری اور عملی تاریخ میں مسلم اہل علم و دانش کو گوناگوں چیلنجوں اور مبارزتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دور تابعین میں وضع حدیث اور قضاء و قدر کے بارہ میں شبہات سے لے کر دور جدید کے مغربی علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کے استیلاء تک کا یہ سارا زمانہ ایک مسلسل فکری جہاد اور علمی دفاع سے عبارت ہے۔ اس پورے دور میں اہل علم نے نہ صرف حالات زمانہ کو پیش نظر رکھا، بلکہ ہر نئی فکری مبارزت کے جواب میں اکثر و بیشتر انہی ہتھیاروں اور وسائل سے کام لیا جن سے کام لے کر اسلام پر اعتراضات کیے گئے۔ اس کی کامیاب ترین مثال یونانی علوم وفنون سے مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ ابتدائی سو، سوا سو سال کے عبوری دور کے بعد بھی مسلمان مفکرین نے یونانی منطق اور فلسفہ سے اسلامی عقائد کی تفسیر و توضیح کی اور اسلامی تعلیمات کی تبیین و تفہیم کا وہ کام لینا شروع کر دیا تھا جس کے عجیب و غریب نمونے امام غزالی، امام رازی، امام شاطبی اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ کی تحریوں میں ملتے ہیں۔

دورِ جدید میں اس کام کی اہمیت اور پیچیدگی پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ پہلے مبارزت صرف ایک میدان میں تھی، یعنی فلسفہ، منطق اور عقلیات کا میدان۔ اب یہ مبارزت زندگی کے ہر میدان میں ہے۔ فلسفہ اور انسانی علوم سے لے کر روزمرہ زندگی کے مظاہر تک، آج ہر قدم پر دنیائے اسلام کو بیرونی اور خارجی قوتوں سے قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔ ان میں سے بعض مقامات میں یہ نبرد آزمائی نسبتاً زیادہ اہم اور فوری نوعیت کی ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ ملت مسلمہ ان معاملات کے بارے میں فوری طور پر اپنے کو صف آرا کرے اور اپنے وسائل و اسباب کو کماحقہ استعمال کرے۔ ان اہم اور فوری امور میں ایک انتہائی اہم مسئلہ قانونی، دستوری اور عدالتی معاملات کا ہے۔ اس میدان میں مغربی تصورات و افکار کے تسلط اور غلبہ نے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو متاثر بلکہ ماؤف کر دیا ہے کہ یہ طبقہ اسلام کے تصورات و نظریات کو سمجھنے میں اس طرح مشکل محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی بھی مغربی دانشور۔ تاہم یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ دنیائے اسلام میں اس صورت حال کے خلاف ایک شدید ردِعمل اٹھتا نظر آ رہا ہے جو اگر مثبت اور تعمیری خطوط پر آگے بڑھا تو ایک بڑی خوشگوار تبدیلی کا ذریعہ بنے گا۔

اسی ردِعمل کا مظہر وہ دلی آرزو ہے جو اسلام کے تصور عدل و احسان پر مبنی معاشرہ کے قیام اور اسلامی تصورات کے عملی نفاذ عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں اٹھتی نظر آتی ہے۔ اسی آرزو کی تکمیل کے انتظار میں آج لاکھوں گردنیں کٹ رہی ہیں، لاکھوں گھر اجڑ رہے ہیں، کتنے ہیں جو گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں اور کروڑوں دل ہیں جو اس دیرینہ خواب کی تعبیر کی تمنا میں دھڑک رہے ہیں۔ لیکن اس خواب کی تعبیر اس قدر آسان نہیں ہے جتنا ہم میں سے بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر ایک طویل سفر کی متقاضی ہے۔ ایسا طویل سفر جس کی پہلی منزل، ایک فکری تبدیلی، ایک تعلیمی تحریک اور ایک ذہنی انقلاب سے عبارت ہے۔ جب تک اسلام کے تصورات و تعلیمات پر گہرا ایمان رکھنے والی، دور جدید میں ان کو روبہ عمل لانے کے جذبہ سے سرشار اور اس راہ کی مشکلات سے کلی طور پر آگاہی اور ادراک رکھنے والی

نسل وجود میں نہیں آئے گی اس وقت تک اس خواب کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

اس پہلی منزل کا پہلا قدم اسلامی فقہ اور قانون کی کماحقہ تعلیم و تدریس اور اس سلسلہ میں ضروری مردان کار کی تیاری کا کام ہے۔ ایسے مردانِ کار جو اسلامی فقہ کو اس کے بنیادی مآخذ و مصادر سے براہ راست سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں، جن کو رائج الوقت قانونی، دستوری، اور عدالتی تصورات سے گہری لیکن ناقدانہ واقفیت حاصل ہو، جو شریعت کی حقانیت اور صلاحیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور دورِ جدید میں اس کی تعلیمات کو روبہ عمل لانے کا مومنانہ جذبہ رکھتے ہوں۔ ایسے افراد کی تیاری وقت کی وہ اہم ضرورت ہے جس کو ہماری ملّی ترجیحات میں ابھی تک وہ جگہ حاصل نہیں ہوئی جو اس کو ہونی چاہیے تھی۔

بلاشبہ ہمارے بہت سے دینی اداروں اور اسلامی تعلیم کے مراکز میں فقہ کی تدریس و تحقیق کا کام ہو رہا ہے اور فقہی موضوعات پر کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ سب کچھ قطعاً ناکافی ہے۔ اس تعلیم و تحقیق کا ہمارے قانونی نظام اور دستوری اداروں پر اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ملک میں نفاذِ اسلام کے کام میں پیش رفت نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم کی گئی۔ اکیڈمی نے وکلاء اور ارکان عدلیہ کے تربیتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ قائم کیا جس کے تحت اُردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر جدید انداز سے اسلامی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کی اشاعت کے ایک طویل المیعاد منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ تصنیف و تحقیق اور نشر و اشاعت کے اس طویل منصوبہ کے ساتھ ساتھ اکیڈمی نے آج سے چند سال قبل ایک شعبہ ایسا بھی قائم کیا جہاں فاصلاتی تعلیم کے اصولوں کے تحت فقہ اسلامی کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ متواضعانہ پیشکش مقبول ہوئی اور اللہ رب العزت نے اپنی بے پایاں نعمت اور لامتناہی فضل سے ہماری اس کاوش کو کامیابی سے نوازا اور ہم تین سال کی مختصر مدت میں اس کورس کے ذریعہ پاکستان اور بیرون ملک پاکستان کے کوئی ڈیڑھ ہزار افراد تک اسلامی قانون اور فقہ کی ایک مربوط اور جامع تصویر پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

زیرِ نظر کورس وکلاء، طلبہ قانون اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لیے ہے۔ اس کا دورانیہ ایک سال ہے اور یہ چوبیس اسباق یا یونٹوں پر مشتمل ہے جن میں فقہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ ہر سبق میں تدریسی مواد کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لیے کتابوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

مطالعہ قانون اسلامی کے اس ابتدائی کورس کے بعد چار دوسرے کورس بھی تیار کرائے جا رہے ہیں جو فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ ہمارے ان ''ایڈوانس کورسز'' کی تیاری کا کام جاری ہے اور جلد ہی ہم ان کو بھی شروع کر دیں گے۔

کچھ اس یونٹ کے بارے میں

زیرِ نظر یونٹ اسلام کے مالیاتی نظام کی ایک اہم کڑی - نظام مصارف - سے بحث کرتا ہے۔

بیت المال سے متعلق معاملات کی دو بڑی قسمیں قرار دی جا سکتی ہے۔ اوّلاً بیت المال کے وسائل و ذرائع آمدن اور ثانیاً حاصل شدہ آمدن کا خرچ اور مدات کی تفصیل۔ گزشتہ یونٹ میں بیت المال کے وسائل آمدن کا تعارف کرایا جا چکا ہے۔ اس یونٹ میں اسلامی ریاست کے متوقع اخراجات پر گفتگو کی گئی ہے۔ ریاست یہ اخراجات باشندگان مملکت کے نائب اور وکیل کی حیثیت سے کرتی ہے۔ اس لیے ان تمام مباحث میں یہ بنیادی حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ریاست کے جملہ وسائل اور آمدنی کے اصل مالک باشندگان مملکت ہی ہیں۔ یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ان وسائل کے اخراجات میں حکمران جہاں باشندگانِ مملکت کو جوابدہ ہیں، وہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی مسئول ہیں۔ پھر باشندگان مملکت کو بھی اپنے مالی معاملات حکمرانوں کے حوالے کر کے بری الذمہ نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ حکمرانوں اور اولی الامر کے ساتھ سمع و طاعت اور تعاون کے ساتھ ساتھ ان کا محاسبہ اور نگرانی بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ بالفاظ دیگر خالق کائنات الہامی راہنمائی کے ذریعے عامۃ الناس اور اولی الامر کی راہنمائی کرتا ہے، عامۃ الناس ہر جائز اور معروف کام میں حکمرانوں کے مطیع اور فرمانبردار ہیں، جب کہ حکمران ان دونوں کی جواب دہی کے ساتھ ساتھ ان کے نائب اور وکیل کے طور پر ریاست کے وسائل پر تصرف کے مجاز ہیں۔

اس یونٹ میں ابتداً اسلامی نظام مصارف کے چند راہنما اصول بیان کیے گئے ہیں جو بیت المال کی آمدنی اور وسائل کے ضمن میں پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ ان اصولوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسلامی ریاست کے بیت المال کو چار بڑی مدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان چار کلیدی اقسام کی ذیلی تقسیم بھی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر پہلی مد کے وسائل آمدن زکوٰۃ و صدقات جیسی عبادات پر مشتمل ہیں۔ یہ ایک مکمل مد ہے جسے نو (۹) ذیلی شعبہ جات میں مزید تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری اور تیسری مد کے اخراجات بھی ذیلی عنوانات میں منقسم ہیں۔ چوتھی مد ٹیکسوں سے عبارت ہے جس کا مکمل احاطہ دشوار ہے۔ اس عنوان سے چند راہنما اصول ہی بیان کیے جا سکتے ہیں۔ عہدِ جدید میں ریاستی امور کا بڑا حصہ ٹیکسوں ہی کے ذریعے چلایا جاتا ہے، اس لیے اس عنوان پر بھی مناسب گفتگو کی گئی ہے۔

یونٹ کے مباحث کا تعلق اصلاً ریاستی امور ہی سے ہے۔ لہذا اس یونٹ کی اہمیت اس اعتبار سے دوچند ہو جاتی ہے کہ عصر حاضر کی کم و بیش تمام مسلم مملکتوں کا ریاستی ڈھانچہ بڑی حد تک اب بھی انہی خطوط پر استوار ہے جو وہاں مغربی استعمار نے قائم کیا تھا۔ بدقسمتی سے مسلم دنیا کے اہل دانش کی بڑی تعداد ابھی تک فکری سطح پر ان نظریاتی مسائل کا ادراک تک کرنے میں ناکام رہی ہے جو مغربی استعمار کے اس فکری اور تہذیبی تسلسل سے پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلم اہل دانش نے سرے سے اس طرف توجہ ہی نہیں کی، یقیناً بہت سے اہل علم و دانش اور متعدد دینی

اداروں اور تحریکات نے اس ضمن میں وقیع کام کیا ہے، لیکن اقبال کے الفاظ میں:

نالہ ہے بلبل شوریدہ تیرا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

عوامی سطح پر ان خیالات کی پذیرائی کے لیے ابھی خاصا وقت اور محنت درکار ہے۔ اہل دانش اور عوام الناس کی فکری توجیہ و تربیت کے بعد ہی کسی ذہنی انقلاب کے ذریعے سے نو آبادیاتی نظام کا وضع کردہ نظام از سر نو اسلامی روایات کی روشنی میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ کورس بھی ہے جس میں اسلام کے قانونی اور فقہی نظام کے بعض اہم گوشوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

وطنِ عزیز کے باشعور اور اہلِ علم اصحاب سے گزارش ہے کہ ہمارس اس کوشش پر ناقدانہ نظر ڈال کر اپنی رائے سے آگاہ کریں تاکہ ہم اپنی کوششوں میں بہتری پیدا کر سکیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری یہ کوشش قبول فرمائے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی
ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۶- جمادی الاخر ۱۴۱۸ھ
۹- اکتوبر ۱۹۹۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

لفظ مصارف اردو ادب میں کسی حد تک اجنبی ہے لیکن اس لفظ سے ملتے جلتے دوسرے الفاظ اجنبی نہیں ہیں۔ صارف خرچ کرنے والے کو کہتے ہیں جسے انگریزی میں **Consumer** کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع صارفین ہے۔ خرچ کی جانے والی اشیاء کو اشیائے صرف بولنا بہت عام ہے۔ مصروف ہونا بہت عام فہم ہے۔ یہ لفظ بھی الفاظ کے اسی خاندان سے متعلق ہے، جب کوئی شخص کام کر رہا ہو تو اسے مصروف کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کی صلاحیتیں اور وقت خرچ ہو رہا ہوتا ہے اس لیے اسم مفعول کے وزن پر اسے مصروف کہا جاتا ہے۔ خرچ ہونے کی کیفیت کو مصروفیت کہا جاتا ہے۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان تمام الفاظ کا مرکزی نکتہ خرچ ہے۔ یہی مرکزی نکتہ لفظ مصارف میں بھی ملتا ہے جو معاشیات کی اصطلاح میں **Expenditure** کہلاتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے نظام مصارف سے مراد اسلام کا **Expenditure System** ہے۔ اس وقت ہم اسلامی قانون، اس کی ریاستی تنظیم اور اسی سے متعلقہ موضوعات پر گفتگو کر رہے ہیں اس لیے یہاں خرچ سے مراد افراد یا گھروں میں ہونے والے خرچ کا نظام زیر بحث نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے بیت المال میں جمع ہونے والے عوامی خزانہ کے اخراجات کی تفصیل پیشِ نظر ہے۔ آئندہ سطور میں اس نسبت سے گفتگو کی جائے گی۔

اسلامی نظام مصارف کے چند راہنما اصول

گزشتہ باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں بیت المال میں جمع ہونے والے محاصل کن ذرائع سے اکٹھے کیے جاتے ہیں؟ ان محاصل کی درجہ بندی کس طرح ہوتی ہے؟ اور ان کے حصول میں کن راہنما اصول کو مدِنظر رکھا جاتا ہے؟ اس باب میں یہ بیان مقصود ہے کہ محاصل خرچ کرتے وقت کن اصول کا خیال رکھنا ضروری ہے؟ خرچ کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اور ان کو کیسے اور کن مدات میں خرچ کیا جائے؟ یہ اصول مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پہلا اصول، اعتدال

مال خرچ کرتے وقت عام طور پر تین انسانی رویے دیکھے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ مال سینت سینت کر رکھا جائے، خرچ کرنے میں بخل سے کام لیا جائے، جہاں مال خرچ کرنا ضروری ہو وہاں بخیلی کا اظہار ہو۔ اس رویّے کو بخل کہا جاتا ہے جسے کنجوسی بھی کہا جاتا ہے۔ بخل کو متوازن ذہن قبول نہیں کرتا۔

دوسرا روّیہ یہ ہے کہ مال بے دریغ خرچ کیا جائے، جہاں جائز ذریعے سے مال کا معمولی حصہ خرچ کرنے سے مسئلہ حل ہو سکتا ہو وہاں بے جا خرچ کیا جائے، سرکاری روپیہ ہو تو انعام و اکرام اور عیش کوشی میں اڑایا جائے،

ذاتی ہو تو اشیائے تعیّشات میں خرچ کر دیا جائے۔ یہ روّیہ اسراف یا فضول خرچی کہلاتا ہے۔ یہ روّیہ بھی معتدل ذہن کے لیے ناقابل قبول ہے۔

تیسرا روّیہ یہ ہے کہ اتنا ہی خرچ کیا جائے جس قدر ضرورت ہو۔ ضرورت خود بخود پیدا ہو، نہ کہ پیدا کی جائے، اور ضرورت پورا کرنے کے لیے وہی ذریعہ اور اسلوب اختیار کیا جائے جس کا تقاضا راہ اعتدال کرتی ہو۔ یہ طریقہ معتدل ہے۔

قرآن حکیم میں یہ تینوں انسانی رویے بیان ہوئے ہیں اور ان تینوں کے احکام موجود ہیں۔

(۱) بخل اور ہوس مال سے گریز

یہ فعل عام طور پر انفرادی ہوتا ہے اس لیے اوّلاً فرد ہی کو خطاب کر کے اس کے احکام نازل ہوئے ہیں لیکن فی الحقیقت ان احکام کے مخاطبین تمام مسلمان اور امت مسلمہ بحیثیت کل ہے۔ بخل، اللہ کے نزدیک کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے، قرآن کریم میں آتا ہے:

وَلاَ یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآاٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًّلَّھُمْ بَلْ ھُوَ شَرٌّلَّھُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَابَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (آل عمران، ۳:۱۸۰)

اور جو لوگ اللہ کے دیئے ہوئے فضل کے معاملہ میں بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ یہ ان کے لیے بہت برا ہے، جس مال میں انہوں نے بخل کیا اس کا طوق قیامت کے روز ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

اس آیت میں بخل کی مذمت ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ہوس مال کی مذمت کر کے اس کا نتیجہ بھی عذاب ہی بتایا گیا ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلاَ یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (توبہ، ۹:۳۴)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک سزا کی خبر دے دو۔

البتہ جو لوگ اپنے آپ کو اس مذموم فعل سے بچانے میں کامیاب ہوگئے ان کے لیے فلاح کی بشارت بھی قرآن میں موجود ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۶۴:۶ (تغابن، ۶۴:۱۶)

اور جو دل کی تنگی سے محفوظ رہے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(۲) اسراف یا فضول خرچی سے اجتناب

بخل کے مقابلے میں اسراف دوسری انتہا ہے۔ یہ بھی مذموم فعل ہے جس کے فاعلین کے لیے وہی حکم ہے جو بخیل کے لیے ہے، قرآن میں آتا ہے:

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ. (اعراف، ۷:۳۱)

کھاؤ پیو مگر حد سے نہ گزرو، اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اللہ کی یہ پسند ناپسند محض بیان کی حد تک نہیں ہے بلکہ حد سے گزرنے والوں کو قرآن کی زبان میں شیطان کا بھائی کہا گیا ہے:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا (بنی اسرائیل، ۱۷:۲۶، ۲۷)

فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

بخل کا تعلق عموماً انسان کے انفرادی فعل سے ہوتا ہے کیونکہ اپنے مال سے محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے خرچ کرنے سے اجتناب کیا جائے، یہی بخل ہے۔ دوسری جانب فضول خرچی اور اسراف کا تعلق بالعموم اپنے مال سے کم ہی ہوتا ہے۔ یہ روّیہ فطرتاً دوسروں کے مال کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کے مظاہر آج کل سرکاری خزانے میں جا بے جا تصرفات کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مختصر فاصلے کا سفر درپیش ہو تو بس یا ریل گاڑی سے طے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سرکاری خزانے میں بے جا تصرف کی شکل ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کرنے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ دفتری اوقات کے بعد ذرا تاخیر سے اجلاس رکھ کر سرکاری خرچ پر مرغن غذائیں منگوانا یا تیار کروانا اور اس کا جواز کام کی زیادتی بیان کرنا، سرکاری افطار پارٹیوں کا اہتمام کرنا، یہ سب اسراف کی مثالیں ہیں۔ یہی اسراف ہے جس کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے۔

(۳) راہِ اعتدال

بخل اور اسراف کے درمیان ایک اوسط راستہ بھی موجود ہے۔ مال خرچ کرنے میں اس کو اختیار کرنا اللہ کریم کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ اس راستے کو اختیار کرنے والے اللہ کے نیک بندے ہیں اور ان کی نشانی یہ ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (فرقان، ۲۵:۶۷)

(اور اللہ کے نیک بندے وہ ہیں) جو خرچ میں نہ اسراف کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

اسلامی نظام مصارف کا پہلا اصول اعتدال ہے۔

دوسرا اصول، امانت

مال رعیت سے جمع شدہ ہو یا قدرتی ذرائع سے حاصل ہونے والی املاک ہوں، حکمران دونوں صورتوں میں ان کے امین ہیں۔ بیت المال کی تمام آمدنی اصل میں رعیت کی اجتماعی ملکیت ہے، حکمران اس کے درست استعمال پر مامور ہونے کی حد تک اس کے ذمہ دار ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''جسے ہم (تحصیل مال کے) کام پر مامور کر کے بھیجیں اسے چاہیے کہ چھوٹی بڑی ہر چیز کا یکساں لحاظ رکھے۔ کیونکہ جو آدمی ایک دھاگہ یا اس کے علاوہ کوئی چیز بھی خیانتاً لے گا وہ غلول کا مرتکب ہوگا اور قیامت میں اس چیز کو اپنے ساتھ لیے ہوئے سامنے آئے گا''[1]۔

امانت ایک ہمہ پہلو تصور ہے اس میں مرئی اور غیر مرئی امانتیں دونوں شامل ہیں۔ ملکی مفاد سے لے کر نقد رقوم تک امانت ہو سکتی ہیں جس کا حق دار کو لوٹانا اللہ کی جانب سے فرض ہے، قرآن میں آتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (نساء، ۴:۵۸)

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو۔

اس آیت اور گزشتہ حدیث کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کی جملہ املاک کے لیے طے شدہ اُجرت کے سوا ایک معمولی دھاگہ بھی اپنی ذات کے لیے زائد لیا جائے تو یہ خیانت کے زمرے میں آتا ہے جس کے لیے سرکاری سطح پر ممکن ہے گرفت نہ ہو سکے لیکن اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا جا سکتا۔ آیت میں حکم ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کے سپرد کرو۔ گویا سرکاری مال و املاک کے کچھ حق دار ہیں۔ یہ مال ایسے ہی جمع نہیں کر لیا جاتا کہ بیت المال میں اضافہ ہوتا رہے بلکہ یہ کچھ لوگوں کی امانت ہے جن کو یہ امانت لوٹا دینا حکام کے ذمہ ہے۔ یہ حق دار لوگ کون ہیں؟ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

تیسرا اصول، عدل

بیت المال میں سے حق داروں کو کچھ دیتے وقت عدل کی راہ اختیار کرنا تیسرا اہم اصول ہے۔ یہاں عدل سے مراد یہ ہے کہ اوّلاً قواعد و ضوابط کے تحت مال سرکاری خزانے میں جمع کیا جائے اور پھر انہی قواعد ضوابط کے تحت حق داروں کو دیا جائے۔ اس اصول سے انحراف تباہی ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ. الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ. وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (مطففین، ۸۳:۱تا۳)

تباہی ہے ان کم تولنے والوں کے لیے جو دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پیمانہ بھر لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔

یہ قاعدہ صرف دکانداروں کے لیے نہیں ہے جو پیمانے سے اشیاء تول کر دیتے ہیں بلکہ اس سے یہ اصول ملتا

ہے کہ لیتے اور دیتے وقت ایک ہی طرح کے قواعد و ضوابط اور پیمانے وضع کیے جائیں۔

سرکاری سطح پر اس اصول سے کسی ایک جگہ انحراف نہیں ہوتا بلکہ اس کے مشاہدات ہمیں قدم قدم پر دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ بجلی یا گیس کا بل جمع کراتے وقت محض ایک دن کی تاخیر پر دس فی صد زائد رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ دوسری جانب یہی سرکاری محکمے افراد، تاجروں اور تجارتی اداروں سے جب اشیاء خریدتے ہیں تو یہ طے ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت یا کم و بیش مدت میں قیمت ادا کر دی جائے گی۔ لیکن عملاً ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ طے شدہ مدت کے اندر رقم ادا ہو۔ یہاں مذکورہ قرآنی اصول کے مطابق خود ان محکموں کو بھی ایک دن تاخیر سے رقم ادا کرنے پر دس فی صد زائد دینا چاہیے لیکن ان محکموں نے اپنے لیے الگ پیمانہ وضع کر رکھا ہے۔ علی ہذاالقیاس یہ محکمے بل کی وصولی کے لیے اسی شہر کے بینکوں کا چیک قبول کرتے ہیں جس شہر کا بل ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے شہر کی صورت میں بینک اپنے ڈاک کے اخراجات وصول کنندہ کے ذمہ ڈالتے ہیں۔ دوسری طرف خود یہ محکمے ہر مقام کے لیے چیک ہی کے ذریعے رقم ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے شہر کی صورت میں وصول کنندہ کو اصل رقم سے قدرے کم رقم ملتی ہے۔ عدل کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ کام ڈرافٹ کی صورت میں ہو تاکہ وصول کنندہ کو پوری رقم ملے۔

چوتھا اصول، عدلِ اجتماعی

عدل ہی کے ضمن میں ایک اصول عدلِ اجتماعی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ معیشت کے جملہ اسباب کی ترتیب و تنظیم اس طرح ہو کہ اس سے معاشرہ کے تمام افراد یکساں مستفید ہوں۔ سرکاری وسائل کا خرچ بارش کے قطروں کی صورت میں ہو جو ہر طرح کی زمین کو یکساں سیراب کرتی ہے۔ محنتی اور جفاکش کسان وقت پر زمین تیار کر کے بارش سے فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔ کاہل، سست اور نکما کاشتکار اس بارش سے کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔ اسی طرح سرکاری وسائل کا رخ عوام کی طرف بارش ہی کی طرح ہو، تعلیم کے مواقع سب کے لیے یکساں ہوں، جو نہ پڑھنا چاہے، اسے یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ وسائل کی کمی کے باعث نہ پڑھ سکا۔ علاج معالجہ کی سہولتیں تمام شہری آبادی کو ایک جیسی حاصل ہوں۔ روزگار کے معاملہ میں تمام شہری آبادی کو عدل و انصاف پر مبنی قواعد و ضوابط کے تحت مقابلہ میں حصہ لینے کا موقع ملے۔ کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہ ہو۔ یہ اصول قرآن میں یوں آتا ہے:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (حشر، ۵۹:۷)

تاکہ دولت تمہارے مالداروں ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔

یہ قرآنی اصول اسلام کے نظام محاصل اور نظام مصارف میں جگہ جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ تقسیم میراث میں بھی ہمیں یہی فکر نظر آتی ہے کہ دولت کا ارتکاز نہ ہو، زکوٰۃ کی روح بھی یہی ہے کہ مال سال بہ سال خرچ ہوکر ایک خاص سطح پر آجائے، صدقات نافلہ کا مقصود بھی یہی ہے کہ دولت کا بہاؤ اُوپر سے نیچے کی طرف رہے، مالی کفارے بھی بالآخر یہی کچھ سکھاتے ہیں کہ غلطی کرنے پر نادار لوگوں کی معمولی ضروریات پوری ہو جائیں۔ الغرض

دولت کی گردش قرآن کی معاشی تعلیمات کا ایک اہم ستون ہے جو محض ایک دائرے میں نہ ہو جس کا مرکز و محور مالدار طبقہ ہو بلکہ یہ سارے معاشرے کے لیے یکساں طور پر مساوی ہے۔

جدید زمانے میں اسے عدل اجتماعی کا نام دیا گیا ہے۔ کہیں اسے فلاحی ریاست کے قیام کی بنیاد بتایا گیا ہے، اور کہیں اسے ریاست کا مقصد وجود بتایا گیا ہے۔ لادینی معاشروں میں تمام معاشی تعلیمات کا مرکز و محور عدل اجتماعی ہی بتایا جاتا ہے لیکن اسلامی معاشرے میں یہ مقصد نہیں بلکہ کچھ دوسرے مقاصد کے لیے معرض وجود میں آنے والی ریاست میں عدل اجتماعی خود بخود قائم ہوتا ہے۔ اسلامی معاشیات میں یہ تصور بہت اہم ہے لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ دوسرے تصورات پس پشت ڈال دیئے جائیں۔ اسلام اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ دولت مالداروں ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔ اس کے بعد اپنی محنت سے کوئی مالدار ہو جائے تو اسے بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے۔

سرکاری خزانے (Public Money) یا بیت المال سے تصرف یا اس کے استعمال کے یہ چند رہنما اصول ہیں جنہیں قرآن و سنّت کے مطالعہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ رہے واقعاتی شواہد تو اسلامی تاریخ کا ہر دور ان سے بھرا پڑا ہے۔ خلافت راشدہ کا دورِ حکومت تو ایک مثالی عہد تھا، بعد کے ادوار میں بھی بے شمار سلاطین و حکام کا سرکاری خزانے سے تصرف خوف خدا اور للّٰہیت پر مبنی ہوتا تھا۔ یہاں پر ان واقعاتی شواہد کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ ان کا زیادہ تعلق تاریخ اسلام سے ہے۔ ثانیاً اس طرح کی مثالیں غیر مسلم معاشرے میں بھی بکثرت موجود ہیں۔ دیانت و امانت صرف مسلمانوں کے پاس نہیں بیشتر غیر مسلم حکمران بھی ان صفات سے متصف ہیں۔ ثالثاً یہ کہ قرآن و سنّت میں بہترین اصولوں کی موجودگی میں اس مختصر مقالے میں تاریخی مثالوں کی گنجائش نہیں ہے۔

فرض کیجئے کہ اسلامی ریاست کا خزانہ گزشتہ باب ''اسلام کا نظام محاصل'' میں بیان ذرائع آمدنی سے معمور ہے اور حکام کو اس میں سے تصرفات کے مذکور بالا چار اصول بھی ذہن نشین ہیں، تو سوال یہ ہے کہ سرکاری خزانے میں سے مال و دولت کی درست تقسیم یا مختلف مدات (Heads) کی ترتیب و تنظیم کیسے ہو؟ آئندہ سطور میں اختصار کے ساتھ یہی بیان کرنا پیش نظر ہے۔

بیت المال کے چار مالیاتی مد

قرآن و سنّت کی تعلیمات کی روشنی میں خلفائے راشدین نے اور بعد کے ادوار میں دوسرے فقہاء و حکام نے جو مالیاتی نظام وضع کیا اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کے قیام کا ایک خاص مقصد ہے۔ یہ محض مال و دولت کا مجموعہ ہی نہیں ہوتا تھا جس میں سونے کے ڈھیر کو ایک طرف یا چاندی کے سکوں کو الگ الگ رکھ کر خرچ کیا جاتا ہو بلکہ مال و دولت جمع کرنے کے بعد عین قرآن و سنّت کی تعلیمات کی روشنی میں تمام مال کی درجہ بندی کی جاتی تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ حلال و حرام کا باقاعدہ خیال رکھا جاتا تھا۔

حلال ذرائع سے حاصل کیا جانے والا مال الگ رکھا جاتا تھا اور حرام اشیاء پر ٹیکس، جیسے ذمی تاجر کے ان درآمدی جانوروں پر ٹیکس جو فی الاصل حرام ہوں، الگ رکھا جاتا تھا۔ دونوں کے خرچ کی تفصیل بھی الگ الگ ہوتی تھی۔ اس کا خاص بندوبست کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں سے جمع شدہ حلال اور طیب مال غیر مسلموں سے جمع شدہ مال کے ساتھ خلط ملط نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں سے جمع شدہ مال اور غیر مسلموں سے حاصل ہونے والے مال کی مدات الگ الگ ہیں اور دونوں کے خرچ کرنے کے مقامات بھی الگ الگ ہیں۔ اسلامی ریاست میں سرکاری خزانہ مندرجہ ذیل مدوں (Heads) میں تقسیم ہو گا۔

۱۔ عبادات، صدقات بشمول زکوٰۃ اور خمس سے حاصل ہونے والی آمدنی پر مبنی مد۔
۲۔ غیر مسلموں سے حاصل ہونے والی آمدنی اور لگان پر مبنی مد۔
۳۔ متفرق
۴۔ ٹیکس، بلا استثناء مذہب۔

ان چاروں مدات کے اخراجات کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ پہلی مد کے اخراجات

پہلی مد مسلمانوں سے حاصل ہونے والے مال پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس پر جملہ اقسام کا خمس، جیسے مال غنیمت، معدنیات اور دفینہ کا خمس بھی شامل ہے۔ مسلمانوں سے حاصل ہونے والے مال میں سونے چاندی پر زکوٰۃ، مویشیوں اور شہد پر زکوٰۃ، پھلوں اور سبزیوں پر زکوٰۃ اور مسلمان تاجروں پر درآمدی برآمدی ٹیکس کے ذریعے حاصل ہونے والا جملہ مال شامل ہے۔ یہ مد کچھ ذیلی شعبوں میں تقسیم کر کے خرچ کی جاتی ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (انفال، ۸:۴۱)

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

اس آیت میں مال غنیمت کے پانچویں حصے کے مزید مصارف بتائے گئے ہیں۔ اللہ کے لیے، اس کے رسول اور رسول کے رشتہ داروں کے لیے، یتیموں کے لیے، مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے، یہ تقسیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک رہی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں رسول اللہ اور ان کے قرابت داروں کا حصہ ختم کر دیا گیا[۲] اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ صرف یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کیا جانے لگا۔

مال غنیمت یوں تو اس مال پر مشتمل ہوتا ہے جو مسلمانوں کو کافر ملک سے جنگ کے دوران میں ملے لیکن

معدنی دولت اور دفینوں کے خمس کے مصارف بھی وہی ہیں جو مال غنیمت کے ہیں۔ یوں فقہاء نے مال غنیمت کی تعریف میں معدنیات اور دفینوں کو بھی شامل کیا ہے۔ اس طرح مال غنیمت کا خمس، تیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ ماسوائے تیموں کے بقیہ دو زمروں کا حصہ زکوٰۃ و صدقات میں بھی ہے۔ اس لیے مال غنیمت اور زکوٰۃ و صدقات کا مالیاتی شعبہ ایک ہی قرار پاتا ہے، قرآن میں آتا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (توبہ، ۹: ۶۰)

یہ صدقات[۳] تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات (کی تحصیل) کے کام پر مامور ہیں۔ اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے اور راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔

اس آیت میں ہمیں زکوٰۃ کے مندرجہ ذیل آٹھ مصارف معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ فقراء پر خرچ
۲۔ مساکین پر خرچ
۳۔ زکوٰۃ جمع کرنے والے افراد پر خرچ
۴۔ جن کی دل جوئی مطلوب ہو، ان پر خرچ
۵۔ غلاموں کو آزاد کرانے پر خرچ
۶۔ قرض داروں پر خرچ
۷۔ فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) خرچ
۸۔ مسافر نوازی کے لیے

ان میں سے مسکین اور مسافر مال غنیمت میں بھی حصہ دار ہیں۔ لہذا فقہاء نے مال غنیمت (جنگی، معدنیات، اور دفینوں) کے خمس اور زکوٰۃ کی آمدنی کو ایک ہی شعبہ قرار دے کر مندرجہ بالا آٹھ شعبوں پر خرچ کرنے کے لیے کہا ہے جن کی تفصیل یوں ہے:

(۱) فقراء پر خرچ

فقراء، فقیر کی جمع ہے۔ فقیر سے مراد وہ شخص ہے جس کے اپنے وسائل اس قدر نہ ہوں کہ وہ اپنا بوجھ اٹھا سکے۔ اردو ادب میں لفظ ''فقیر'' جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے، عربی اور اصطلاحی معنوں میں اس سے وہ مراد بالکل

نہیں ہے بلکہ ہر تنگ دست، نصاب سے کم مالیت کا اندوختہ رکھنے والا شخص فقیر ہے۔ موجودہ دور میں کم آمدنی والے ملازمین پر بھی یہ تعریف صادق آ سکتی ہے بشرطیکہ وہ صاحب نصاب نہ ہوں۔ اس لیے وہ بھی اس خرچ میں سے کسی نہ کسی طریقے سے حصہ پانے کے اہل ہیں۔ کم آمدنی والے ریٹائرڈ افراد بھی، جن کی پنشن ان کی گزر بسر کے لیے نا کافی ہو، فقیر کی تعریف میں داخل ہو سکتے ہیں۔

(۲) مساکین پر خرچ

مساکین، مسکین کی جمع ہے، مسکین سے مراد وہ شخص ہے جو یکسر تہی دست ہو۔ صاحب نصاب ہونا تو درکنار صاحب معاش بھی نہ ہو۔ اردو میں لفظ ''فقیر'' جن معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی اصطلاحی معنوں میں اس کے لیے لفظ ''مسکین'' ہے۔ مسکین، فقیر سے زیادہ خستہ حال ہوتا ہے اور اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں بے روزگار افراد، وہ بالغ طلباء جن کے والدین ان کی کفالت نہ کر سکتے ہوں اور بیوائیں، مساکین کے زمرے میں آ سکتے ہیں۔ بے کس اور بے سرو سامان معذور افراد بھی مسکین کی تعریف میں شامل ہیں جن کی کفالت کرنے والا کوئی دوسرا نہ ہو۔

مساکین کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اولاً وہ مساکین جن کے لیے وظائف مقرر کرنا ہی ان کی مدد ہو جیسے معذور افراد، بیوائیں اور کم آمدنی والے پنشن یافتہ ریٹائرڈ ملازمین وغیرہ۔ دوسری قسم ان افراد کی ہے جن پر اس مد میں سے خرچ کر کے انہیں مفید خدمات پر مامور کیا جا سکتا ہے۔ یوں وہ مسکین کی تعریف سے نکل کر عام آسودہ انسان کی طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں جیسے نادار طلباء اور بے روز گار افراد کی مناسب مالی تنظیم کے ساتھ مدد کرنے پر انہیں تکمیل تعلیم اور روز گار مہیا کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ممکن ہے کہ یہ افراد مستقبل میں خود زکوٰۃ دینے والے ہو جائیں۔

(۳) زکوٰۃ جمع کرنے والے افراد پر خرچ

قرآن مجید میں انہیں ''العاملین علیھا'' یعنی عاملین زکوٰۃ کہا گیا ہے۔ عاملین زکوٰۃ وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ وصول کرنے، اسے سرکاری خزانے میں پہنچانے اور پھر اسے مستحقین تک پہنچانے پر مامور ہوتے ہیں۔ اس عمل میں ناظم حسابات سے لے کر ایک ادنیٰ اہل کار تک کے مشاہرے شامل ہیں۔ انتظامی عملے کی تنخواہوں اور دوسرے ضروری اخراجات میں کفایت اور اعتدال ضروری ہے۔ امام ابو یوسف کہتے ہیں:

''عاملین زکوٰۃ کو امام (Head of State) بقدر ضرورت تنخواہیں دے گا۔ یہ تنخواہیں زکوٰۃ میں وصول ہونے والے مال کے ۱/۸ سے کم بھی ہو سکتی ہیں اور زیادہ بھی، البتہ تحصیل زکوٰۃ کے لیے تنگی یا اسراف کے بغیر متوسط معیار سے گزر بسر کے لیے کافی ہوں''(۴)۔

عاملین زکوٰۃ کی اجرت طے کرنا بڑا نازک کام ہے۔ ایک طرف یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ جو لوگ دوسروں کی تنگ دستی دور کرنے کے لیے کام کریں خود تنگ دست نہ ہوں تو دوسری طرف ان کی تنخواہیں اتنی زیادہ بھی نہ ہوں کہ دوسرے مستحقین زکوٰۃ یہ خیال کرنے لگیں کہ فی الاصل یہ مال تو ان کا ہے، عاملین زکوٰۃ ان کے مال پر کیوں عیاشی کریں۔ تیسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ عاملین زکوٰۃ اتنے کثرت سے نہ ہو جائیں کہ ہر طرف ''تحصیل زکوٰۃ'' ہی نظر آئے، ''تقسیم زکوٰۃ'' کا وجود بہت کم ہو۔ یہ حکام پر منحصر ہے کہ عاملین زکوٰۃ کی تقرری میں اپنی صوابدید کو کس طرح استعمال کرتے ہیں، آج کل کی اصطلاح میں محض بے روز گاری دور کرنے کے لیے عاملین زکوٰۃ کا بھرتی کیا جانا اسلام کے مقاصد کے خلاف ہے۔

(۴) مُؤَلَّفَۃُ القلوب کے لیے خرچ

یہ وہ افراد ہیں جن کی دلجوئی کرنا اسلام کے پیش نظر ہے۔ یہ وہ غیر مسلم افراد ہو سکتے ہیں جو اسلام کے بارے میں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھنے یا دوسری وجوہ کے باعث اسلام کے کام آ سکتے ہیں، ایسے افراد پر بھی اس مد میں سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اس نوع میں بہت سے افراد شامل ہیں۔ وہ لوگ جو اسلام پر ایمان لا چکے ہوں لیکن اس پر پختہ نہ ہوں وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ وہ لوگ بھی اسی تعریف میں آتے ہیں جو اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہوں اور ان کی مخالفت مؤثر ہو، لیکن مالی اعانت کے زور پر ان کی مخالفت کو ختم یا کم کیا جا سکتا ہو۔

مُؤَلَّفَۃُ القلوب کے بارے میں حنفی فقہاء کا کہنا ہے کہ یہ مد اب ختم ہو گئی ہے۔ ان کی دلیل حضرت عمرؓ کی وہ رائے ہے جو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے دور میں دی تھی کہ اسلام کی کمزوری کے زمانے میں ان لوگوں کو دیا جانا تو قابل فہم ہے، اب اسلام مضبوط ہے اس لیے اب ان کی مدد کرنا کوئی ضروری نہیں۔ تمام صحابہؓ نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ یہی وجہ ہے کہ احناف اس مد کے سقوط کے قائل ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ مُؤَلَّفَۃُ القلوب اب باقی نہیں رہا(۵)۔

زکوٰۃ کے بارے میں سورہ توبہ کی مذکورہ آیت ۶۰ کو اور اس واقعہ کو، جس میں صحابہؓ کا اس مد کے سقوط پر اجماع ملتا ہے، ملایا جائے اور آج کل کے حالات، سامنے رکھے جائیں تو ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ قرآنی حکم میں زکوٰۃ کی تقسیم کا قاعدہ بطور امر قانون (Question of Lavv) بیان ہوا ہے جس کی تائید جب تک امر واقعہ (Question of Fact) سے نہ ہو، اس وقت تک اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک امر قانون اور امر واقعہ پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ لہذا قرآنی حکم پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں امر واقعہ، امر قانون کے مطابق نہ رہا اس لیے نص پر عمل درآمد روک دیا گیا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ آئندہ جب کبھی اس امر واقعہ اور امر قانون میں مطابقت پیدا ہو جائے، یہ مد بحال ہو سکتی ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ کسی معاشرے سے مساکین ختم ہو جائیں تو مساکین کی مد ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تنگ دست قرض دار

معاشرے میں نہ ہوں تو یہ خرچ کسی دوسرے مفید کام پر ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور میں مُؤَلَّفَۃُ القلوب کی بحالی کے لیے علماء کو نئے سرے سے غور کرنا چاہیے۔ دنیا بھر میں مختلف ذرائع سے لابی کرنے، نشرواشاعت کے لیے، پروپیگنڈا کرنے اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے کثیر مالی وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایک ملک اپنے متحارب ملک کے اندر اپنی پالیسیوں کی نشرواشاعت کے لیے وہاں کے اخبارات و جرائد کے صحافیوں سے کام لیتا ہے، بین الاقوامی سطحوں پر سفارت کاری کے ذریعے قومی مفاد حاصل کیے جاتے ہیں، دشمن ملک کے سیاست دانوں کو خرید کر اپنے حق میں رائے عامہ ہموار کی جاتی ہے، ان سب کاموں کے لیے سالانہ میزانیہ (Annual Budget) میں خاطر خواہ رقوم رکھی جاتی ہیں اور جہاں ملکی مفاد کے پیش نظر ان رقوم کا ظاہر کرنا ممکن نہ ہو وہاں حکام کے صوابدیدی اختیارات کے تحت رقوم خرچ کی جاتی ہیں۔ غور کیا جائے تو یہ سب کچھ مُؤَلَّفَۃُ القلوب کی تعریف میں آ سکتا ہے۔ وقت اور ظروف بدل جانے کے بعد اگرچہ یہ سب کچھ نیا ہے لیکن فی الاصل ان کا مقصد وہی ہے یعنی اسلام یا اسلامی ریاست کے بارے میں دشمن کے نرم رویہ کا حصول۔ اس لیے اس مد پر آج کل کے حالات میں غور وفکر کی ضرورت ہے اور یہ کام علماء کے ذمے ہے۔

(۵) غلاموں کو آزاد کرانے پر خرچ

اس وقت دنیا میں نہ تو آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنانا ممکن ہے اور نہ متحارب ریاستوں کے جنگی قیدیوں کو غلام لونڈی کی شکل میں سپاہ میں تقسیم کرنے کا رواج ہے۔ اس لیے آج کل مصارف زکوٰۃ کی مدات میں سے یہ مد بظاہر ساقط ہے۔ دراصل اس مد کا مقصد یہ تھا کہ غلامی کو سرے ہی سے ختم کیا جائے جس کے لیے کوئی ''انقلابی'' اعلان کر کے معاشرتی تار و پود بکھیرنے کی بجائے تدریج اور ترغیب کا راستہ اختیار کیا گیا۔ یہ مد اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کے پہلو بہ پہلو آئندہ کے لیے آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنانا ممنوع قرار دیا گیا۔ جنگی غلامی بھی ریاست کے لیے آخری چارہ کار ہے، وجوب کا درجہ نہیں رکھتی(۶)۔

آج کل کے حالات میں اس مد کے وجود پر مزید غور وفکر کی ضرورت ہے۔

(۶) قرض داروں کی اعانت

قرآن میں ان لوگوں کے لیے ''الغارمین'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ غارم کی جمع ہے۔ غارم وہ شخص ہے جو صاحب نصاب نہ ہوتے ہوئے قرض دار ہو۔ فقہاء نے غارم کے لیے ایک سے زائد تعریفات وضع کی ہیں، ان سب تعریفات میں مشترک بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مقروض ہونے کے ساتھ صاحب نصاب بھی ہو تو وہ اس تعریف پر پورا نہیں اترتا۔

قرض داروں پر خرچ کرنے کے لیے یہ اہم مد ہے لیکن آج کل کے بڑے بڑے تجارتی، صنعتی اور زرعی

قرضے حاصل کرنے والے اس تعریف میں نہیں آتے بلکہ غارمین کی تعریف میں کارفرما روح یہ ہے کہ تنگ دست، تہی دامن اور مفلس افراد کی خبرگیری کی جائے، نہ مترفین کی اعانت کی جائے۔ آج کل ذاتی مکان بنانے کے لیے قرض لیا جاتا ہے پھر تنگ دستی کے باعث اسے واپس لوٹانا ممکن نہیں ہوتا۔ متعلقہ ادارہ یا محکمہ مکان کی قرقی یا نیلامی کا بندوبست کرتا ہے۔ اگر قرض دار صاحب نصاب نہ ہو اور واقعی قرض لوٹانے کی حالت میں نہ ہو تو اس مد سے اس کی مدد کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

غارمین میں فقیر اور مسکین دونوں شامل ہو سکتے ہیں۔

(۷) فی سبیل اللہ خرچ

لغوی معنی اللہ کی راہ میں (خرچ) ہے۔ لیکن یہ اصطلاح وسیع المفہوم ہے کیونکہ اللہ کی راہ میں خرچ کو کسی ایک گوشے میں محصور کرنا آسان نہیں ہے۔ امام ابو یوسف کے خیال میں یہ مد ان سڑکوں کی تعمیر و مرمت پر خرچ کی جائے گی جو مسلمانوں کی گزرگاہیں ہوں[۷]۔ امام صاحب کی یہ رائے اس وجہ سے ہے کہ زکوٰۃ کا مال مسلمانوں سے حاصل ہوتا ہے لہذا اسے مسلمانوں ہی پر خرچ ہونا چاہیے۔ موجودہ دور میں اس رائے پر اس لیے عمل کرنا دشوار ہے کہ سڑکیں اور راستے تمام لوگ بلاامتیاز مذہب استعمال کرتے ہیں۔ ابوعبید القاسم بن سلام نے یہ مد مجاہدین کے لیے مختص قرار دی ہے۔ اپنی اس رائے کی تائید میں انہوں نے عطاء بن یسار سے مروی ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نقل کی ہے جس میں ان پانچ افراد کا ذکر ہے جو زکوٰۃ کا مال حاصل کر سکتے ہیں۔ ان پانچ میں سے چار یا تو وہی ہیں جن کا ذکر گزشتہ آیت میں آچکا ہے یا غیر متعلقہ افراد ہیں۔ صرف ایک ''غازی'' ایسا ہے جس کا بیان کہیں نہیں ہوا اس لیے آپ نے اسے فی سبیل اللہ کے مفہوم میں لے لیا ہے[۸]۔ یہی رائے ماوردی کی ہے، "الاحکام السلطانیۃ" میں آتا ہے:

> '' اس سے مراد مجاہدین ہیں ان کو اس میں سے جہاد کی ضرورت کے موافق دیا جائے اگر چھاؤنی ڈال کر رہنے والے ہوں تو جانے کا اور بقدر امکان وہاں کے قیام کا خرچ دیا جائے اور اگر جہاد سے واپس آنے والے ہوں تو آمد و رفت کا خرچ دیا جائے''[۹]۔

ان آراء کی روشنی میں فی سبیل اللہ کے مفہوم میں جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس لیے یہ مد مجاہدین پر خرچ کی جا سکتی ہے۔

(۸) مسافروں پر خرچ

اس کے لیے ابن السبیل کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ ابن السبیل مسافر ہیں اور مسافر سے مراد عام ہے۔ ہر وہ شخص جو غنی ہو یا فقیر یا مسکین، سفر کے دوران میں مسافر ہی کہلاتا ہے۔ اس لیے زکوٰۃ کی یہ آٹھویں مد

مسافروں کے لیے مختص ہے۔ وہ لوگ جو حالت سفر میں رہتے ہوں، خاص طور پر بیرونی ممالک میں جاتے رہتے ہوں، جانتے ہیں کہ عام حالت میں مال و دولت رکھنے والے افراد بھی سفر کی حالت میں کبھی کبھی محتاج ہو سکتے ہیں۔

آج کل کے زمانے میں حصول روزگار کے لیے دوسرے ممالک میں جانے والے ناخواندہ اور نیم خواندہ افراد بسا اوقات ایسے افراد کی معرفت کام کرواتے ہیں جو بعد میں جعل ساز ثابت ہوتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں پہنچنے پر علم ہوتا ہے کہ ان کا ویزا تو بہت مختصر مدت کے لیے ہے اور واپسی کا ہوائی ٹکٹ بھی یک طرفہ ہے۔ وہاں یہ افراد، جو اپنے وطن میں آسودہ حال ہوتے ہیں، کوڑی کوڑی کو محتاج ہو کر ادھر ادھر سے مانگ کر واپسی کا بندوبست کرتے ہیں۔ زکوٰۃ کی یہ مد آج کل کے دور میں اگر دوسرے ممالک میں سفارت خانوں کی صوابدید پر چھوڑ دی جائے تاکہ وہ اس طرح کے معاملات نمٹا سکیں تو یہ مسافروں پر خرچ ہی کہلائے گا۔ تاہم اس پر مزید غور کی ضرورت ہے۔

(۹) یتیموں پر خرچ

سورہ توبہ کی آیت ۶۰ میں آٹھ مصارف زکوٰۃ کا ذکر ہے جن پر مبنی گزشتہ آٹھ مدات قائم کی گئی ہیں۔ لیکن اس سے قبل سورہ انفال کی آیت ۴۱ میں مسکین اور مسافر سے پہلے آپ یتیم کے بارے میں بھی پڑھ چکے ہیں جن کا خمس میں سے حصہ ہے اور آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ خمس صرف مال غنیمت کے پانچویں حصے کا نام نہیں بلکہ فقہاء نے اس میں دفینوں اور معدنیات کا خمس بھی شامل کیا ہے۔ اس طرح کے خمس میں یتیموں، مساکین اور مسافروں کا حصہ ہے۔ یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ صدقات کے نام سے معروف، پہلی مد میں زکوٰۃ عشر اور مسلمان تاجروں سے حاصل ہونے والے درآمدی برآمدی محاصل کے ساتھ خمس بھی شامل ہے۔ اس مد کے آٹھ مستحقین کا بیان سورہ توبہ آیت ۶۰ میں موجود ہے۔

نواں مصرف یتیموں پر خرچ ہے۔ یتیم سے مراد وہ فرد ہے جس کا باپ فوت ہو گیا ہو اور وہ خود سن بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔ بالغ فرد یتیم کی تعریف میں نہیں آتا۔ یتیم پر خرچ کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ انفرادی طور پر یتیموں کے لیے وظائف بھی مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب یتیم اپنے کسی عزیز سرپرست کی نگرانی میں ہو۔ ایسے ممکن ہو تو یتیموں کو اجتماعی گھروں میں رکھ کر ان کے وظائف مقرر کرنا بھی درست ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر اٹھنے والے اخراجات بھی اسی مد سے پورے ہو سکتے ہیں اور ان کی کفالت کے لیے دوسرے ناگزیر اخراجات بھی اسی مد سے متعلق ہیں۔

۲۔ دوسری مد کے اخراجات

ابتداء میں ہم نے اسلامی ریاست کے بیت المال کو چار مدات (Heads) میں تقسیم کیا تھا جن میں سے

پہلی مد کا بیان مکمل ہوگیا۔ دوسری مد اس مال پر مشتمل ہے جسے بالعموم غیر مسلموں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس میں جزیہ، خراج، غیر مسلم تاجروں پر عائد ٹیکس اور لگان (کراء الارض) شامل ہیں۔ اس مد سے ہونے والے عمومی اخراجات کی تفصیل کچھ یوں ہو سکتی ہے۔

(۱) غیر مسلموں پر خرچ

اس مد سے اوّلاً غیر مسلموں کی فلاح و بہبود کے کاموں پر رقم صرف کی جاتی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ایک حاکم کو امور سلطنت کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے لکھا ''اور دیکھو تمہارے علاقہ میں جو عمر رسیدہ، کمزور اور کمائی سے لاچار ذمی ہوں ان کا بیت المال سے مناسب و حسب ضرورت وظیفہ مقرر کر دو''۔ اس خط میں آپ مزید لکھتے ہیں کہ ''میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا کہ مجھے امیر المومنین حضرت عمرؓ کے متعلق اطلاع ملی ہے کہ وہ ایک ایسے بوڑھے ذمی کے پاس سے گزرے جو دربدر لوگوں سے بھیک مانگ رہا تھا۔ تو انہوں نے کہا، ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تیری جوانی میں تو ہم تجھ سے جزیہ وصول کرتے رہے۔ پھر بڑھاپے میں تجھے اس طرح دربدر کا بھکاری بنا کر چھوڑ دیا۔ پھر انہوں نے بیت المال سے اس کے لیے وظیفہ جاری کر دیا''[۱۰]۔

(۲)۔ عاملین کا مشاہرہ

عاملین زکوٰۃ کی طرح عاملین جزیہ، عاملین خراج اور اس مد کے دوسرے محاصل کی تحصیل پر مامور اہل کاروں کا محنتانہ بھی اسی مد سے ادا کیا جاتا ہے[۱۱]۔ البتہ عاملین زکوٰۃ اور زیر بحث مد کی تحصیل و تقسیم پر مامور اہل کاروں میں ایک فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کے عاملین صرف اپنی اجرت لینے کے روادار ہیں، دوسرے انتظامی اخراجات زکوٰۃ و صدقات کی مد سے پورے نہیں کیے جا سکتے لیکن اس مد کی تحصیل و تقسیم کے انتظامی اخراجات بھی اسی سے پورے کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ اصول اعتدال و اصول کفایت پیش نظر رہے۔

(۳) حکومت کے انتظامی اخراجات

مملکت کا نظام چلانے کے لیے معمولی اہل کار کی تنخواہ سے لے کر اعلیٰ عہدے داروں کے مشاہرے بھی اسی مد سے متعلق ہیں۔ اشخاص کی اجرت کے علاوہ دوسرے دفتری اخراجات بھی اسی مد سے پورے کیے جا سکتے ہیں، نقل وحمل کے لیے گاڑیوں کی فراہمی، دفتروں میں کاغذ قلم کی ضرورت پوری کرنے، دفتری ساز و سامان، عمارتوں کی تعمیر و کرایہ اور پانی بجلی پر اٹھنے والے مصارف اس مد سے پورے کیے جا سکتے ہیں۔

امن و امان قائم کرنے کے لیے پولیس پر اٹھنے والے اخراجات اور سرحدوں کے دفاع کے لیے افواج کو دی جانے والی تنخواہیں بھی انتظامی اخراجات ہی سے پوری کی جاتی ہیں۔ پولیس اور افواج کے لیے ہتھیار، گولہ بارود، ذرائع نقل وحمل، ہر طرح کا رائج الوقت جنگی ساز و سامان اور قیام گاؤں پر اٹھنے والے اخراجات بھی انتظامی

اخراجات سے پورے کیے جا سکتے ہیں۔

(۴) ترقیاتی منصوبے

نہروں کی تعمیر، صفائی، پانی کے بندوں کی تعمیر، دریاؤں، ندی نالوں پر پلوں کی تعمیر یہ سب ترقیاتی کام ہیں۔ ان پر اٹھنے والے اخراجات بھی اس مد سے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے میں ناکارہ نہروں کی صفائی و بحالی کے اخراجات بیت المال سے پورے کیے جائیں، الگ سے کوئی ٹیکس عائد نہ کیا جائے(۱۲)۔ وہ چھوٹی چھوٹی نہریں جن کے ذریعے لوگ اپنی زمینوں، کھیتوں، انگور کی کیاریوں، کھجوروں، باغات اور ترکاری کے کھیتوں وغیرہ تک پانی لے جاتے ہیں تو ان کی کھدائی اور صفائی کے اخراجات انہی افراد کو برداشت کرنے ہوں گے جو پانی استعمال کرتے ہیں(۱۳)۔ آگے چل کر امام صاحب لکھتے ہیں:

> ''چونکہ زمینوں کی بربادی وغیرہ کا تعلق مصالح عامہ سے ہے اور ان کا برا اثر خراج کی آمدنی پر پڑتا ہے لہذا اس سلسلہ کے جملہ مصارف بیت المال سے پورے کیے جائیں''(۱۴)۔

(۵) قیام عدل

انتظامی اخراجات سے ہٹ کر عدلیہ پر اٹھنے والے مصارف بھی ایک مستقل مالیاتی شعبے کا تقاضا کرتے ہیں جس کے لیے الگ سے رقوم مختص کرنا (Funds Allocation) ضروری ہوتا ہے۔ یہ رقوم بھی اسی مالیاتی شعبے سے پوری کی جاتی ہیں۔ عدلیہ کے نظام کے ساتھ ساتھ اسلام کا نظام احتساب، عادلانہ نظام کے قیام کی راہ ہموار کرتا ہے۔ یہ ایک نیم عدالتی اور نیم انتظامی شعبہ ہے۔ اس پر اٹھنے والے اخراجات بھی اسی مد سے پورے کیے جاتے ہیں۔ امام ابویوسفؒ کے خیال میں قاضیوں کے علاوہ دوسرے عمال کو بھی اسی مد سے مشاہرے دیئے جا سکتے ہیں۔ آپ خلیفہ ہارون الرشید کے نام خط میں فرماتے ہیں:

> ''قاضیوں اور والیوں کے مشاہرے مسلمانوں کے بیت المال سے دیجئے، یعنی زمین کے محاصل یا خراج اور جزیہ میں سے۔ چونکہ یہ لوگ مسلمانوں کی خدمت میں مشغول ہیں لہذا ان کو جو کچھ دینا ہو مسلمانوں کے خزانہ سے دیا جائے گا۔ ہر شہر کے والی اور قاضی کو اس کی ذمہ داریوں کی مناسبت سے مشاہرہ دیا جائے گا۔ جس آدمی کو بھی آپ مسلمانوں کے کسی کام پر مامور کریں اس کا مشاہرہ مسلمانوں کے خزانہ سے دیجئے۔ تحصیل صدقات پر مامور والیوں کے علاوہ دوسرے والیوں اور قاضیوں کے مشاہرے صدقات کی مد سے نہیں دیئے جائیں گے۔ البتہ صدقہ کے والی کا مشاہرہ اس مد سے دیا جائے گا جیسا کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے (مصارف زکوٰۃ کی آیت میں) "**والعاملین علیھا**" فرما کر صراحت کر دی''(۱۵)۔

(۶) خبر رسانی

سرکاری حکام، والیوں، قاضیوں اور دوسرے عمال کی سرگرمیوں، اثاثوں اور تصرفات کے بارے میں مختلف ذرائع سے خبریں اکٹھی کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے تاکہ انتظام سلطنت میں بدعنوانی در آتے ہی اس کا قلع قمع کیا جا سکے۔ اس کام پر اٹھنے والے مصارف بھی اسی مد سے پورے کیے جاتے ہیں۔ امام ابو یوسف، ہارون الرشید کو نصیحت کرتے ہیں کہ ''ہر بڑے شہر یا علاقہ کے راست باز اور قابل اعتماد افراد کو منتخب کر کے ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ ان کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ ان افراد کا وظیفہ بیت المال سے مقرر کیا جائے اور ان کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جائیں''۔ آگے چل کر امام صاحب اس کام سے متعلق ذرائع نقل و حمل کے استعمال کے بارے میں فرماتے ہیں ''ان لوگوں کو ہدایت کر دیجئے کہ ڈاک کے لیے باربرداری کے جو جانور ان کے پاس ہوں ان پر صرف ان لوگوں کو سوار کیا کریں جن کو آپ نے مسلمانوں کے کاموں کے سلسلہ میں سواری فراہم کرنے کا حکم دیا ہو کیونکہ یہ جانور سارے مسلمانوں کی ملکیت ہیں[۱۶]۔ (یہاں ڈاک سے مراد آج کل کی پوسٹل سروس نہیں بلکہ امام صاحب کے وقت کا سرکاری محکمہ خبر رسانی ہے جو ریاستی امور کے بارے میں حکام کو باخبر رکھتا تھا)۔

(۷) دعوت و تبلیغ

دعوت دین انفرادی فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ امت پر بحیثیت اجتماعی بھی فرض ہے۔ ہر شخص پر لازم ہے کہ اللہ کے آخری دین کی دعوت دوسروں تک پہنچائے۔ یہ کام کبھی تنہا ممکن ہے اور کبھی اس کے لیے حکومت کی پشت پناہی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ میں اس قدر وسعت اور تنوع پیدا ہو چکا ہے کہ ان کے ذریعے اکیلے فرد کی کوشش بار آور ثابت نہیں ہوسکتی۔ بعض صورتوں میں تو صرف حکومت ہی کے ذریعے دعوت دین دینا ممکن ہوتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات بالعموم حکومتی دائرہ اثر میں رہتی ہیں اس لیے ان ذرائع کی مدد سے دعوت دین کا فرض ادا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ جس پر اٹھنے والے مصارف اس مد سے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ اس بارے میں حتمی رائے علمائے کرام ہی دے سکتے ہیں۔

۳۔ تیسری مد کے اخراجات

اسلامی ریاست کی مذکورہ چار مالیاتی مدات میں سے تیسری مد متفرق مال پر مشتمل ہے۔ متفرق سے مراد اموال فاضلہ ہے۔ اموال فاضلہ میں کئی اشیاء شامل ہیں۔ لاوارث[۱۷] مسلمان یا ذمی کا ترکہ، مسلمان مرتد اور باغی کا ترکہ جو بحق سرکار ضبط ہو جائے، سرکاری جنگلات سے آمدنی، چوروں سے برآمد ہونے والا وہ مال مسروقہ جس کے بارے میں نہ چوروں کو علم ہو اور نہ اس مال کا کوئی دعویدار ہو، پانی کے سرکاری بندوں سے حاصل ہونے والی مچھلی کی فروخت سے آمدنی، قاضی یا حاکم کے صوابدیدی اختیارات کے تحت جرمانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی، مثلاً آج کل ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر جرمانے عائد کیے جاتے ہیں، اسی طرح محتسب کے عائد کردہ جرمانے بھی اموال

فاضلہ کی مد میں داخل ہوتے ہیں۔

یہ مد فلاحی کاموں اور کفالت عامہ کے کاموں پر صرف کی جاتی ہے۔ عام طور پر کفالت عامہ کے مصارف زکوٰۃ و صدقات سے پورے کیے جاتے ہیں لیکن دو اعتبار سے اس میں اور زکوٰۃ و صدقات سے متعلق کفالت عامہ میں فرق ہے۔ پہلا فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کی رقوم سے کفالت عامہ پر خرچ کی جانے والی رقم صرف مسلمان فقراء، مساکین، قرض داروں، غازیوں اور مسافروں پر خرچ کی جاتی ہے، کسی غیر مسلم کو زکوٰۃ کی آمدنی سے کچھ دینا جائز نہیں (سوائے مُؤَلَّفَۃُ القلوب کے، جن کا تعلق کفالت عامہ سے بہرحال نہیں ہے) جب کہ اس مد سے کفالت عامہ کے کاموں پر بلاامتیاز مذہب خرچ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کی آمدنی سے افراد کی براہ راست مدد کی جاتی ہے۔ ان کی مدد کرتے وقت تملیک شرط ہے (تملیک سے مراد مال کی مکمل ملکیت منتقل کرنا ہے) اگر زکوٰۃ کی رقم سے کوئی عمارت بنائی جائے جس کی آمدنی سے لوگوں کی مدد کی جائے یا اس میں غرباء کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا جائے تو یہ جائز نہیں لیکن اموال فاضلہ کی مد سے ایسے کاموں پر خرچ کرنا جائز ہے۔ عاملین زکوٰۃ کے مشاہرے تو زکوٰۃ کی رقم سے دیئے جا سکتے ہیں لیکن زکوٰۃ انتظامیہ کے لیے دفتر قائم کرنا جائز نہیں جب کہ اموال فاضلہ کی مد سے ایسا کرنا درست ہے۔

اس مالیاتی شعبے کے اخراجات کی ترتیب و تفصیل یوں ہے:

(ا) بلا امتیاز مذہب نادار افراد پر خرچ

اموال فاضلہ کی آمدنی سے یتیموں، بیواؤں، غریب طالب علموں، بے روزگاروں، معذوروں اور دوسرے نادار افراد کو وظائف دیئے جا سکتے ہیں۔ ایسے تمام طبقات کی کفالت کی ذمہ داری ریاست پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ و رسولہ مولی من لامولی لہ[۱۸]

جس کا کوئی خبر گیر نہیں، اللہ اور اس کے رسول اس کے خبر گیر ہیں۔

یہاں اللہ اور اس کے رسول سے مراد ریاست اور حاکم ہیں جن پر نادار افراد کی بحالی قانوناً فرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین نے اپنے اپنے دور حکومت میں ہمیشہ اس کا اہتمام کیا کہ ان کی قلمرو میں کوئی نادار فرد نہ ہو۔

- نادار افراد کی بحالی، یہ شکل مستقل بنیادوں پر طویل مدتی (Long Term) ہے۔ فوری اور مختصر مدتی (Short Term) ضروریات کی تکمیل کے لیے اللہ کریم نے مسلمانوں پر کئی اخلاقی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ جیسے یہ ڈراوا کہ وہ شخص جنت کی ہوا سے بھی محروم رہے گا جس کا پڑوسی بھوکا سویا ہو اور خود اس نے خوب پیٹ بھر

کر کھانا کھایا ہو، صدقۃ الفطر، عیدالاضحیٰ پر قربانی، روزہ توڑنے پر کفارہ، قسم توڑنے پر کفارہ وغیرہ۔ ان سب کی تفصیل گزشتہ باب میں گزر چکی ہے۔ یہ سب معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داری کی انفرادی شکلیں ہیں۔

(۲) قیدیوں پر خرچ

قید خانوں کا نظام چلانے کے لیے بھی اسی مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے، لیکن قید خانے میں محبوس قیدیوں پر صدقات و زکوٰۃ اور اس مد (اموال فاضلہ) دونوں میں سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں امام ابو یوسف، ہارون الرشید کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"آپ یہ انتظام صدقہ کی مد سے کریں یا بیت المال کی دوسری مدات سے، دونوں گنجائش موجود ہیں[۱۹]۔"

امام صاحب کے اس خط سے یہ صراحت نہیں ہوتی کہ انہوں نے یہ رائے مسلمان قیدیوں کے بارے میں دی یا بلاامتیاز دین و مذہب تمام قیدیوں کے لیے۔ گزشتہ اقوال کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ مسلمان قیدیوں ہی کے بارے میں رائے دی ہے کیونکہ صدقہ کا مال صرف مسلمان ہی پر صرف کیا جا سکتا ہے۔

قیدیوں کے دوسرے انتظامی اخراجات پورے کرنے کے لیے بھی یہ مد استعمال کی جا سکتی ہے۔

(۳) اجتماعی کفالت

نادار افراد کی بحالی کے لیے زکوٰۃ صرف کرتے وقت تملیک شرط ہے۔ اس لیے زکوٰۃ کی آمدنی خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو، افراد کے ہاتھوں میں براہ راست چلی جاتی ہے۔ ان کی بحالی کے لیے کسی اجتماعی شکل میں کام کرنا ممکن نہیں ہوتا، لیکن اس مد سے یہ کام ممکن ہے۔ معذور افراد کو ان کے حسب حال ہنر سکھانے کے لیے درسگاہ قائم کی جا سکتی ہے تاکہ انہیں بحال کیا جا سکے جس میں مختلف پیشوں کی تعلیم دی جائے تو جائز ہے۔ بیوہ اور حاجت مند خواتین اگر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیں تو ان کے لیے دستکاری سکھانے کے لیے گھروں کی تعمیر و مرمت اور ان کے اقامتی علاقوں میں رفاعی کاموں پر خرچ ہونے والی رقم بھی اس مد سے پوری کی جا سکتی ہے۔ غرض یہ کہ اس مد سے ہر اس رفاعی کام پر، جو کثیر افراد کے لیے سودمند ہو، خرچ کیا جا سکتا ہے۔

(۴) متفرق

اموال فاضلہ، متفرقات سے متعلق ہیں ان کے خرچ کرنے میں یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیے کہ یہ نادار افراد کی کفالت کے لیے ہیں۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے امام اپنے زمانے میں حالات کے مطابق نئے اسلوب بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اموال فاضلہ کو خرچ کرنے کے لیے حاکم اس اصول کی روشنی میں صوابدیدی اختیار رکھتا ہے۔

۴۔ چوتھی مد کے اخراجات

چوتھی مد بلاامتیاز مذہب عائد کیے جانے والے ٹیکسوں پر مشتمل ہے۔

ٹیکسوں کے حصول کے لیے چند راہنما اصول گزشتہ باب میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ یہاں پر ٹیکس عائد کرنے کے لیے مزید ایک بات بیان کرنا پیش نظر ہے کیونکہ اس کا خرچ سے گہرا تعلق ہے۔

ٹیکس عائد کرتے وقت یہ سوال سامنے رکھنا بھی اہم ہے کہ ٹیکس کیوں عائد کیا جا رہا ہے؟ اس جواب ہی کی روشنی میں ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی آمدنی خرچ کی جا سکتی ہے۔ یہ بات بالکل منطقی ہے کہ جب ضرورت ہو گی حکومت ٹیکس عائد کرے گی۔ اصل سوال یہ ہے کہ ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور جب ٹیکس نافذ کرنے کے بعد رقم اکٹھی ہو جائے تو ضروری ہے کہ یہ رقم اسی ضرورت کو پورا کرنے پر صرف کی جائے جس کی بنا پر ٹیکس عائد کیا گیا ہو۔ اگر ایسے نہ ہو تو سرے سے اس ٹیکس کی ضرورت ہی نہ تھی یا ضرورت از خود پیدا کی گئی، یا ضرورت تو موجود ہے لیکن اسے پورا کرنے میں فرض سے پہلو تہی کی جا رہی ہے۔ یہ سب باتیں بیت المال (Public Money) میں خیانت کے مترادف ہیں۔ دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ٹیکس عائد کرتے وقت اس کا مقصد بھی بتایا جائے۔ مثال کے طور پر اس وقت پاکستان میں اقراء ٹیکس کے نام سے ایک ٹیکس معمولی شرح سے درآمدی اشیاء پر عائد ہے۔ یہ ٹیکس لگاتے وقت صراحتاً بتایا گیا تھا کہ اس سے حاصل ہونے والی رقم تعلیم کے فروغ پر خرچ کی جائے گی۔ یہ اس ٹیکس کی وجہ تھی۔ اب یہ رقم دفاع، انتظامیہ یا وفاقی منصوبوں پر خرچ کی جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ٹیکس لگانے کا مقصد پورا نہیں کیا جا رہا ہے۔

آج کل کی حکومتیں رعایا پر ٹیکس عائد کرتے وقت خود کو سرے سے اس کا پابند ہی نہیں سمجھتیں کہ عوام کو اس کی غرض و غایت ہی بتا دیں۔ جہاں دیکھتی ہیں کہ افراد یا ادارے اپنی محنت یا کسی تجارتی سرگرمی سے معاشی نمو کے عمل کو تیز کر رہے ہیں، ان کے وسائل آمدنی بڑھ رہے ہیں فوراً کسی نہ کسی ٹیکس کی لپیٹ میں لے آتی ہیں۔ نہ ٹیکس عائد کرنے والے اس کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ ٹیکس کی غرض و غایت واضح ہونے کے بعد ہی لوگوں کے اموال میں سے کچھ حاصل کریں، نہ ٹیکس دہندگان قانون اور شریعت کا اتنا فہم رکھتے ہیں کہ اپنے جائز حقوق ہی حاصل کر سکیں۔

ٹیکس اسلامی نظام مالیات کی آخری مد ہے، وسائل جمع کرنے کے لیے یہ آخری چارہ ہے۔ پہلی تین مدات کے مناسب استعمال اور منصوبہ بندی کے بعد بظاہر ٹیکسوں کی ضرورت نہیں رہتی لیکن بعض خصوصی حالات جیسے جنگ، قحط، سیلاب، زلزلہ، وبائی امراض کی حشر سامانی، داخلی شورش اور خشک سالی وغیرہ میں ٹیکس نافذ کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ٹیکس عائد کیا جا سکتا ہے اور حاصل ہونے والی رقم کو اسلامی نظام مالیات کی روح کے مطابق صرف اس کام کے لیے خرچ کیا جائے جس کے لیے ٹیکس عائد کیا گیا ہو۔ حالات کی تبدیلی کے باعث یا کسی اور وجہ سے یہ ممکن نہ رہے تو مزید ٹیکس حاصل کرنے کو موقوف کر کے جمع شدہ رقم رعیت کی رضا مندی سے کسی دوسرے مفید کام

پر صرف کی جا سکتی ہے۔ اسلامی ریاست کے حکام رعیت سے موصول ہونے والی ایک ایک پائی کو درست، جائز اور شرعی طریقے سے خرچ کرنے کے پابند ہیں۔ اس سے ہٹ کر خرچ کرنے پر وہ اللہ کے مجرم ہوں گے ہی، خود رعایا کو بھی ان سے سوال کرنے کا حق ہے کہ حاصل کی جانے والی رقوم کا جائز اور درست استعمال ہوا یا نہیں۔ یہ نظام اس قدر مربوط اور شرعی پابندیوں میں کسا ہوا ہے کہ حکام اس سے ہٹ کر خرچ کرنے کی کوئی اجازت ہی نہیں ہے۔ انسانی زندگی کے جملہ لوازم اس نظام سے پورے ہو سکتے ہیں۔

اس نظام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چار میں سے پہلے تین مالیاتی شعبے تو نصوص اور تاریخ اسلام کے نظائر سے لیے گئے ہیں۔ ان کے خرچ کی تفصیل بھی موجود ہے۔ جس کی روشنی میں حکام کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں کہ ثقافت، کلچر یا جمالیات کے نام پر رقص و موسیقی، بے مقصد کھیل تماشے، فنون لطیفہ، آرٹ، سنگ تراشی، قومی دنوں پر آتش بازی، مجسمہ سازی اور گانے بجانے کے پروگراموں کا اہتمام کرے۔ اسلام کو تو ایک طرف رکھیے خود آج عوام سے ان مصرفانہ افعال کے بارے میں سوال کیا جائے تو ان کا جواب بھی ان کے بارے میں منفی ہی ہو گا۔

چوتھا مالیاتی شعبہ ٹیکسوں کی آمدنی پر مشتمل ہے جن کی تفصیل آمدنی ہمیں قرآن و سنت سے نہیں ملتی اور اخراجات کے بارے میں واضح راہنمائی بھی صرف ان اصولوں کی صورت میں ملتی ہے جن کا ذکر اس باب کے شروع میں واضح کیا جا چکا ہے۔ لیکن رعیت پر ٹیکس عائد کرنا اسی وقت جائز، شرعی اور قانونی ہوتا ہے جب ان ٹیکسوں کی ضرورت ہو۔ ظاہر بات ہے کہ عوام کی پہلی ضرورت تو پینے کا صاف پانی، صحت و صفائی، علاج معالجہ، تعلیم و تربیت اور روزگار کی فراہمی ہے۔ یہ وہ ابتدائی لوازم ہیں جو ہر باشندے کے لیے اہم ہیں۔ پہلے تین مالیاتی شعبوں کی آمدنی سے ان کا مہیا کرنا ممکن نہ ہو تب رعیت پر ٹیکس عائد کرنا جائز ہے لیکن اگر کسی ملک کے باشندوں کو یہ بنیادی سہولتیں دستیاب نہ ہوں اور حکام ''ثقافتی سرگرمیوں'' کے نام پر مترفین کے ''ذوق جمال'' کے لیے تعیشات کا اہتمام کرنے کی غرض سے رعیت پر ٹیکس عائد کریں تو یہ بیت المال میں خیانت کے مترادف ہے اور ایسا کرنے والے عوام کے خادم نہیں خائن ہیں۔ ان کا ٹھکانہ دنیا میں جیل اور آخرت میں جہنم ہے۔

ٹیکس کا نفاذ دو فریقوں کے غیر تحریری عہد و پیمان کے ذریعے ہوتا ہے جس کی پابندی رعیت پر تو اس وجہ سے لازم ہے کہ خلاف ورزی کرنے پر حکومت اپنے وسائل استعمال کر کے نادہندگان کو تعزیری سزا دے سکتی ہے لیکن حکومت اور حکام کو عوام کی جانب سے کسی سزا یا تعزیر کا خوف نہیں ہوتا۔ ان کے لیے صرف اصول امانت کے پاس داری ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے ایک جرنیل حضرت ابو عبیدہؓ شام کے ایک علاقے حمص پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیوں سے جزیہ وصول کر چکے تھے۔ کسی جنگی تدبیر کی وجہ سے یہ شہر خالی کر کے انہیں دمشق کی جانب کوچ کرنا پڑا۔ شہر خالی کرنے سے پہلے حضرت ابو عبیدہؓ نے حکم دیا کہ جتنا جزیہ عیسائیوں سے وصول کیا گیا ہے۔ وہ انہیں واپس

کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اب ہم ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے اس لیے اس جزیہ پر بھی ہمارا کوئی حق نہیں۔ لہذا ساری رقم انہیں واپس کر دی گئی(۲۰)۔

مسلمان مؤرخین اور علماء اس واقعہ کو اعلیٰ اسلامی اخلاق کی ایک مثال، فرض شناسی اور غیر مسلم رعیت کے ساتھ حسن سلوک کے ضمن میں بیان کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں درست ہیں لیکن اس تاریخی واقعہ کا ایک پہلو اور بھی ہے جس کا تعلق ٹیکس کے نفاذ سے ہے۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ بیت المال کے لیے حاصل کی جانے والی رقم کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور جو رقم جس مقصد کے لیے حاصل کی جائے، اسی پر صرف کی جائے۔ بلاوجہ بیت المال میں سونے چاندی کے ڈھیر نہ لگائے جائیں۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے دوسرے ٹیکسوں کے بارے میں بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر محصول کا کوئی نہ کوئی مقصد ہونا لازمی ہے۔ تحصیل محصول کے بعد اس مقصد کا پورا کرنا بھی اتنا ہی لازم ہے۔ کسی وجہ سے وہ مقصد پورا نہ ہو سکے تو رعیت سے جمع شدہ رقم واپس کی جائے۔

کسی اسلامی ریاست کے بیت المال میں جمع ہونے والی مدات میں سے چوتھی اور آخری مد ٹیکس کے مصارف وہی ہوتے ہیں جن کے لیے ٹیکس عائد کیا جا رہا ہے۔ ٹیکس عائد کرتے وقت عامۃ الناس کی فلاح پیش نظر ہو اور یہ بلاامتیاز ہوں۔ اگر آبادی کے تمام طبقات سے رقم جمع کرنے کے بعد کسی ایسے کام پر خرچ کی جائے جو محض کسی ایک طبقے کی ضرورت کو پورا کرے تو یہ اصول عدل کے منافی ہونے کے باعث درست نہیں ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے

گزشتہ باب میں اسلام کے مالیاتی نظام کی ترتیب و تنظیم کے بیان کے بعد اس باب میں خرچ کے بارے میں چند راہنما اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد تمام وسائل آمدنی کو چار بڑی اور اہم مدات میں تقسیم کر کے ان کے اخراجات کی ذیلی مدات کا بیان بھی کیا گیا، ٹیکس کے بارے میں اسلام کا مزاج بیان کیا گیا۔ تاہم ایک مضمون کی حدود میں یہ سب کچھ تفصیل کے ساتھ لکھنا ممکنات میں سے نہیں ہے۔ اس لیے اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ پڑھنے کے خواہش مند اصحاب ''مصادر و مراجع'' میں دی گئی کتب، خصوصاً ابو عبید القاسم بن سلام کی ''کتاب الاموال'' اور امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' سے رجوع کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اسلام کے اقتصادی نظام کے کئی پہلوؤں پر اُردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جو مندرجہ ذیل کتب میں دیکھا جا سکتا ہے:

۱۔ اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، لاہور۔

۲۔ اسلام میں عدل اجتماعی، ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، لاہور

۳۔ اسلام کے معاشی نظریے، جلد اوّل دوم، یوسف الدین، کراچی

۴۔ معاشیات اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور

۵۔ فقہ الزکوٰۃ، (ترجمہ) علامہ یوسف قرضاوی، لاہور

۶۔ مقدمہ ابن خلدون، (ترجمہ) کراچی۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین کا فہم عطا فرمائے، آمین!

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ابو یوسف، کتاب الخراج (ترجمہ، اسلام کا نظام محاصل، محمد نجات اللہ صدیقی، مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۳۶۰)

۲۔ ابو یوسف، ص ۱۴۶، حوالہ ایضاً

۳۔ صدقات سے مراد زکوٰۃ ہے۔

۴۔ ابو یوسف، ص ۲۹۲، حوالہ ایضاً

۵۔ ابو یوسف، ص ۲۹۲، حوالہ ایضاً

۶۔ غلامی کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر سمجھنے کے لیے ملاحظہ کیجئے ''اسلام میں غلامی کی حقیقت'' مولانا سعید اکبر آبادی، مکہ پبلشرز، لاہور

۷۔ ابو یوسف، ص ۲۹۲، حوالہ ایضاً

۸۔ ابو عبید القاسم بن سلام، (ترجمہ، عبدالرحمٰن طاہر سورتی، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۹۰۴)

۹۔ ماوردی، الاحکام السلطانیہ (ترجمہ، مولانا سیّد محمد ابراہیم، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۷)

۱۰۔ ابوعبید، ص ۶۷، ۶۸، حوالہ ایضاً

۱۱۔ ماوردی، ص ۲۴۹، حوالہ ایضاً

۱۲۔ ابو یوسف، ص ۳۵۴-۳۵۵، حوالہ ایضاً

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۵۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۵۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۱۵

۱۶۔ ابو یوسف، ص ۱۴-۵۱۳، حوالہ ایضاً

۱۷۔ اصطلاح میں لاوارث سے مراد آج کل کے حادثاتی موت مرنے والے وہ لوگ نہیں ہیں جن کا اتا پتا معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ افراد ہیں جن کے جائز شرعی وارث نہ ہوں جو ان کی وراثت میں حصہ دار ہوسکیں۔

۱۸۔ ترمذی: کتاب الفرائض

۱۹۔ ابو یوسف، ص ۴۳۳، حوالہ ایضاً

۲۰۔ بلاذری، فتوح البلدان (ترجمہ، سیّد ابوالخیر مودودی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۰۶)

مصادر و مراجع

۱۔ ابوعبید: القاسم بن سلام (۲۲۴ھ) "کتاب الاموال" (ترجمہ، عبدالرحمٰن طاہر سورتی، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۷۶ء)

۲۔ ابو یوسف: یعقوب بن ابراہیم (۱۸۲ھ) "کتاب الخراج" (ترجمہ، اسلام کا نظام محاصل، ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، کراچی، مکتبہ چراغ راہ، ۱۹۶۶ء)

۳۔ بلاذری: احمد بن عیسیٰ بن جابر (۲۷۹ھ) "فتوح البلدان" (ترجمہ، سیّد ابوالخیر مودودی، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)

۴۔ ماوردی: ابوالحسن علی بن محمد حبیب البصری البغدادی (۴۵۰ھ) "الاحکام السلطانیة" (ترجمہ، مولانا سیّد محمد ابراہیم ایم-اے، لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۹۸۸ء)۔

''مطالعہ اسلامی قانون'' کے مطبوعہ مضامین

۱۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ اول۔قرآن

۲۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ دوم۔سنت

۳۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ سوم۔اجماع

۴۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ چہارم۔قیاس

۵۔ اجتہاد کی تعریف

۶۔ اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار

۷۔ دینی مسائل میں اختلاف، اسباب اور ان کا حل

۸۔ اسلام کا قانون نکاح وطلاق

۹۔ اسلام کا قانون وراثت ووصیت

۱۰۔ اسلام میں عورت کی استثنائی حیثیت اور اس کی وجوہ

۱۱۔ اسلام کا تصور ملکیت ومال

۱۲۔ اسلام کا تصور معاہدہ

۱۳۔ اسلام میں شراکتی کاروبار کا تصور

۱۴۔ مزارعت اور مساقات

۱۵۔ اسلام کا نظام محاصل

۱۶۔ اسلام کا نظام مصارف

۱۷۔ اسلام میں عدل وقضاء کا تصور

۱۸۔ اسلام کا نظام احتساب

۱۹۔ اسلامی نظام عدل وقضاء میں شہادت کا تصور

۲۰۔ اسلام کا تصور جرم وسزا

۲۱۔ اسلام کا فوجداری قانون

۲۲۔ اسلام کا دستوری قانون

۲۳۔ اسلام کا قانون بین الممالک

۲۴۔ اسلام میں ربا کی حرمت اور بلاسود سرمایہ کاری